فطرتِ انسانی قرآن اور حدیث

کی روشنی میں

غلام حسین اظہر، لیکچرار گورنمنٹ کالج راولاکوٹ آزاد کشمیر

تاریخِ انسانی کے صدیوں پر محیط واقعات اور آئے دن رونما ہونے والے حوادث پر ہم جب نگاہ ڈالتے ہیں تو انسان کی شخصیت کے ایسے عجیب و غریب اور متضاد پہلو سامنے آتے ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ انسان کی فطرت کی اُفتاد کیا ہے؟ آگ اور خون کے دریا سے گزر کر انسان کو بچانے والا انسان دوسرے لمحے اپنے ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اُتارتا نظر آتا ہے۔ چنگیز کی خون آشام تلوار ہزاروں انسانوں کو تباہ و برباد کر دیتی ہے تو سقراط ہنسی خوشی انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے زہر کا پیالہ نوش کر جاتا ہے۔ ان عجیب و غریب واقعات کو پڑھ کر انسان کے دل میں فطرتِ انسانی کو جاننے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ انسان کیا محض بدی یا محض نیک ہے یا نیکی اور بدی کا مجموعہ۔ وہ حالات کے ہاتھوں مجبور ہے یا اپنی تقدیر کا خود خالق ہے۔ ذہن میں ایسے سوالات بار بار اُبھرتے ہیں۔ اور روزِ ازل سے اب تک انسان اس گتھی کو سلجھانے میں مصروف ہے۔

فطرتِ انسان کے بارے میں ان اہم ترین سوالات کا جواب دریافت کرنے کی ہر دور میں کوشش کی گئی ہے۔ مختلف مفکرین نے اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات اور روحِ عصر کی روشنی میں مختلف نظریات پیش کئے ہیں۔ مفکرین کا وہ گروہ جس کی نگاہ تاریخِ انسانی کے بھیانک اور روح فرسا پہلوؤں تک محدود رہی ہے اُس نے انسان کو سراپا شر قرار دیا ہے۔ اور اس شر کی مختلف وجوہ اور اس کے مختلف حل تجویز کئے ہیں۔ بدھ مت کے نزدیک خواہشات کی نفی سے اس شر سے نجات ممکن ہے۔ ہندومت کے نزدیک تناسخ کے ذریعے اس شر کے اثر سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔ دام مارگیوں کی دانست میں نیک اور بد کی تمیز ختم کر دینی چاہیئے۔ چنانچہ وہ نجاست تک سے پرہیز نہیں کرتے۔ عیسائیت اس شر کی وجہ موروثی گناہ کو قرار دیتی ہے۔ اور اس گناہ کا کفارہ حضرت مسیحؑ نے ادا کیا ہے۔ فلسفیوں اور ماہرینِ نفسیات کی بھاری اکثریت انسان کو مجبورِ محض گردانتی ہے۔ ان کے نظریات کے مطابق انسان کی حیثیت سمندر میں ایک تنکے کی سی ہے۔ جو بے دست و پا

دھارے کے رُخ پر بہتا چلا جاتا ہے۔ اور سمندر کے تھپیڑے اس کی منزل کو متعین کرتے ہیں۔ اس کے بس کی کوئی بات نہیں۔ بہت سی بحثوں کے بعد یہ حضرات انسان کو ماحول کے سامنے سرنگوں کر دیتے ہیں۔ اور انسان کو طبعاً مجرم تصور کرنے کے بعد اس مزمن مرض کے علاج کے نسخے تجویز کرتے ہیں۔ اس بہت بڑے گروہ کے مقابلے میں ایک محدود گروہ ان مفکرین کا ہے جس نے انسان کی اچھائیوں پر توجہ دی ہے۔ لیکن یوں کہ اس کی کمزوریاں اس کی نظر سے اوجھل ہو گئی ہیں۔ ان تمام مفکرین کے نظریات میں کسی نہ کسی حد تک صداقت موجود ہے۔ لیکن یک رُخا مطالعہ کی کرشمہ سازی نے انہیں متوازن رائے قائم کرنے نہیں دی۔ اسلام نے ان تمام نظریات کے برعکس انسان کے اچھے اور بُرے دونوں پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر انسانی فطرت کے بارے میں معتدل اور متوازن نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ اُس نے انسان کو فرشتہ قرار دیا ہے نہ محض حیوان۔ بلکہ ان دونوں نظریات کے برعکس یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ انسان میں نیکی اور بدی کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ اور ان میں اسے امتیاز کرنے کی صلاحیت بھی بخشی گئی ہے۔ لیکن ان کو بروئے کار لانے میں انسان ہزارہا دِقتوں اور مجبوریوں کے باوجود آزاد ہے۔ اسلام انسان کو ایک درندہ قرار نہیں دیتا، جو نیکی اور بدی کے امتیاز سے بے بہرہ ہے اور اسے یونہی دنیا میں بغیر رہنمائی کے پھینک دیا گیا ہے۔ انسانی فطرت کے بارے میں قرآن مجید نے قطعی اور واضح الفاظ میں یہ رائے پیش کی ہے:۔

۱۔ ونفس وما سواھا فالھمھا فجورھا وتقواھا قد افلح من زکھا وقد خاب من دسھا۔

۲۔ الذی خلق فسوٰی والذی قدر فھدیٰ۔

۳۔ بل الانسان علیٰ نفسہٖ بصیرۃ ولو القیٰ معاذیرہ۔

ان مذکورہ آیات میں قرآن نے بالوضاحت یہ بیان کیا ہے کہ انسان کے نفس میں نیکی اور بدی الہام کر دی گئی ہے۔ خداوند تعالیٰ نے اس میں صلاحیتوں کے ودیعت کرنے کے ساتھ نیکی اور بدی میں تمیز کی صلاحیت بھی بخشی ہے، اور انسان خواہ کتنے ہی بہانے تراشے، اس کا ضمیر اسے نیکی اور بدی سے ہمیشہ آگاہ کرتا رہتا ہے۔ اس نظریہ سے قرآن نے ان تمام نظریات کو باطل قرار دیا ہے جو ایسے نظریہ ارتقا کے قائل ہیں، جو انسان کو حالات کی گونگی اور بہری قوتوں کے سامنے ہیچ قرار دیتا ہے جس کے نزدیک انسان روشنی کی تلاش میں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے۔ روشنی کی تلاش میں کاروانِ زندگی اب تک

بھٹکتا آرہا ہے، اور کئی پُرخطر گھاٹیوں میں انسانیت بار بار لہولہان ہوئی ہے۔ قرآن اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ روشنی کی شمع قلبِ انسان میں روزِ ازل سے روشن ہے۔

نظریۂ ارتقاء کے غلط تصور کی تردید اور خیر و شر کے بارے میں متوازن نقطۂ نظر پیش کرنے کے بعد قرآن نے جبر و قدر اور فرد اور سماج کے اس متنازعہ فیہ مسئلہ پر بھی روشنی ڈالی ہے جو خرد کی گتھیاں سلجھانے سے بتدریج اُلجھتا گیا ہے۔ قرآن کا نقطۂ نظر یہ ہے:۔ انا ھدینٰہ السبیل اما شاکراً و اما کفورا۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا۔ قرآن نے اس عذر لنگ کو ختم کر دیا ہے جس کی بنیاد پر اپنے گناہوں کا پھندہ معاشرے کے گلے میں لٹکانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

قرآن نے انسانی فطرت کے بنیادی خدوخال کو بیان کرنے اور جبر و اختیار کی حدود کے تعین کے علاوہ اس اہم مسئلہ کو بھی سلجھایا ہے کہ انسان میں نیکی اور بدی کی جو قوتیں ودیعت کی گئی ہیں، ان کا مقصد کیا ہے۔ اور نیکی اور بدی کی یہ قوتیں انسان کو گرداب میں اُلجھانے کے بجائے اس کے لئے کیسے پتوار کا کام دیتی ہیں۔ اس مسئلہ میں بیشتر مفکرین نے ٹھوکر کھائی ہے۔ انہیں انسان نیکی اور بدی کی قوتوں کے ہاتھوں میں کھلونا نظر آیا ہے۔ اور انھوں نے اس آب و گل کے ہنگامہ کو ایک کھلنڈرے کا کھیل تصور کیا ہے، جو انسان کو مختلف مصائب میں اُلجھا کر تماشا دیکھ رہا ہے۔ یونانی المیہ کی بنیاد ہی اس تصور پر استوار ہے۔ قرآن کا نقطۂ نظر اس نظریہ کے بالکل برعکس ہے۔ قرآن کے نزدیک انسانی فطرت میں تمام ودیعت کردہ صلاحیتیں، جو سطحی نظر میں برسرِ پیکار نظر آتی ہیں، ایک دوسرے کی ممد و معاون اور لازم و ملزوم ہیں اور انسانی شخصیت کی تکمیل کے لئے ان کا وجود ناگزیر ہے۔ قرآن نے "احسن تقویم" "تسویہ" اور "عدل" کے جو الفاظ بار بار دہرائے ہیں، ان کا مقصد اس حقیقت کی نقاب کشائی ہے کہ انسانی فطرت میں ہی اس کی خرابی مضمر نہیں بلکہ ان کا غلط استعمال تباہی و بربادی کا سبب بنتا ہے۔ اس حقیقت کا اظہار ہی ان آیات کریمہ کا اصل مدعا ہے۔

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ ثم رددناہ اسفل سافلین۔

اسفل سافلین کی منزل انسان کی اپنی کوتاہ اندیشیوں اور بداعمالیوں کا نتیجہ ہے، ورنہ انسان میں ودیعت کردہ تمام جبلتیں انسان کے انفرادی وجود اور اس کے نوعی وجود کی بقا کے لئے اشد ضروری ہیں اور انسان کی بقا کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے، ان میں سے ہر ایک خواہش اور اس کے حصول کی استعداد انسان کی سرشت میں رکھی گئی ہے۔ اصل مقصد ان صلاحیتوں کا متوازن استعمال ہے۔ اسلام ان صلاحیتوں

میں کسی صلاحیت کے دبانے یا مٹانے کا ہرگز قائل نہیں۔ اصل قابلِ اعتراض چیز ان کا بے محابا اظہار اور افراط و تفریط کی راہ ہے۔ انسان میں ودیعت کردہ جبلتیں انسان کی راہ میں رکاوٹ بننے کی بجائے اسے کیسے ترقی کی راہ پر لے جاتی ہیں، شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس موضوع پر بڑی فکر انگیز اور سیر حاصل بحث کی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے ہر کمزوری پر غالب پانے والی صلاحیت کی نشان دہی بھی کی ہے۔ مثلاً "وہ ملکہ جس سے حرص و آز کے دواعی کی مدافعت کی جاتی ہے اسے "قناعت" کہا جاتا ہے۔ اور وہ ملکہ "جس سے عجلت اور جلد بازی کے دواعی کی مدافعت کی جائے، اُسے "تانی" کہا جاتا ہے۔ اور وہ ملکہ جس سے "غیظ و غضب" کی مدافعت کی جائے، اس کا نام حلم ہے"۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے جن چند پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے، اس زاویۂ نظر سے اور انسانی جبلتوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر وہ جبلت جو بظاہر ہمیں ضرر رساں نظر آتی ہے۔ وہ دراصل بہت سے ایسے نقصان دہ امور کا تدارک کرتی ہے جو انسانیت کی بقا کے لیے زہر ہلاہل ہیں۔

انسانی جبلتوں کی اہمیت اور افادیت اور ان کے بظاہر متناقض پہلوؤں میں ربط باہم کی نشاندہی کے علاوہ قرآن کے غائر مطالعہ سے ان قوتوں کا بھی ادراک ہوتا ہے جو بدی کی راہ میں روک بنتی ہیں۔ فرائڈ کی نظروں سے چونکہ یہ پہلو اوجھل تھا اس لئے وہ CATHEXES اور ANTI CATHEXES کا نام تو لیتا رہا لیکن وہ ان کے اس مدعا تک نہ پہنچ سکا۔ یہ CATHEXES اور ANTI CATHEXES کی کھینچا تانی درحقیقت نفسِ امارہ، نفسِ لوامہ اور نفسِ مطمئنہ کی کش مکش ہے۔ انہی تین حالتوں کو جدید نفسیات کی اصطلاح میں ہم "اِڈ" (ID) الیغو اور سپر الیغو بھی کہہ سکتے ہیں۔ پہلی حیوانی حالت ہے، جو انسانی خواہشات اور نفسانی میلانات کا بے محابا اظہار چاہتی ہے۔ الیغو نفسِ لوامہ کا کام دیتی ہے۔ الیغو، سپر الیغو اور اڈ کے درمیان سمجھوتے اور ان میں کلی یگانگت سے نفسِ مطمئنہ کی کیفیات جنم لیتی ہیں۔ نیکی اور بدی میں امتیاز کی صلاحیت کے اظہار کی صورت کو قرآن نے نفسِ انسانی کی ان تین حالتوں سے واضح کیا ہے۔ نفسِ لوامہ کے کام کو واضح کرنے کے لئے قرآن نے "حیا، منکر اور معروف" کی اصطلاحیں بھی پیش کی ہیں۔ ان اصطلاحوں کا بنیادی مقصد بھی اس حقیقت کا اظہار ہے کہ انسان بعض اوقات حیوانی سرشتوں سے مغلوب ہو جاتا ہے لیکن یہ "حس" جسے مذکورہ بالا اصطلاحوں سے واضح کیا گیا ہے، انسان کو سرزنش کرتی ہے۔ یہ حس انسان کو گناہ سے روکتی بھی ہے۔ اور گناہ سرزد ہونے کے بعد اس کے دل میں چٹکیاں بھی لیتی رہتی ہے اسلامی

تعلیم و تربیت کا اصل مقصود انسان میں چھپے ہوئے اس مادے کو فہم و شعور کی غذا مہیا کرنا ہے۔ اس صلاحیت کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "جب تجھ میں حیا نہیں جو جی چاہے کر" اور اسی وجہ سے حضورؐ ہر کام کے بارے میں یہ فرمایا کرتے تھے کہ تو اپنے دل سے پوچھ، دل کی کسک اور کھٹک اسی حس کا مظہر ہے۔ جوں جوں یہ کند ہوتی جاتی ہے، انسان گناہوں میں دلیر ہوتا جاتا ہے۔ حضور اکرمؐ نے چند احادیث میں اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے:۔

۱۔ "نیکی طمانیتِ قلب ہے، اور شر وسوسہ اور دل کی کھٹک"

۲۔ "نیکی حسنِ خُلق ہے اور بدی وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے"

انسان میں نیکی اور بدی کے امتیاز کی یہ صلاحیت کیسے جنم لیتی ہے، اور کیسے آہستہ آہستہ بعض انسانوں اور معاشروں میں یہ صلاحیت مردہ ہو جاتی ہے۔ اس پہلو پر قرآن و حدیث نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ قرآن حکیم میں "نفس لوامہ" اور حیا کی کھٹک کی واضح مثالیں سورہ یوسف اور سورہ مائدہ میں موجود ہیں۔ برادرانِ یوسف جب یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینکتے ہیں تو نفسِ لوامہ کی کسک کو یوں دُور کرتے ہیں کہ آئندہ وہ توبہ کر لیں گے۔ سورۂ مائدہ میں قابیل اور ہابیل کے قصہ میں بھی اسی نفسیاتی کیفیت کو پیش کیا گیا ہے۔ ہبوطِ آدم میں بھی اسی نفسیاتی کیفیت کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے۔ نفسِ لوامہ کی کیفیات اور مجرموں کی نفسیات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے سادہ اور دل نشیں انداز میں یوں پیش کیا ہے:۔ جب کوئی بندہ گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ ڈال دیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بدی کی رغبت اس کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن جب وہ توبہ کرتا ہے، یہ داغ مٹ جاتا ہے اور اس کا دل صاف ہو جاتا ہے۔ لیکن جب وہ بار بار گناہ کرتا ہے تو اُس کا دل پوری طرح سیاہ ہو جاتا ہے۔ اس کا نام رین ہے۔ رین کی کیفیت کو قرآن نے انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ وان علیٰ قلو بھلم ما کانو یکسبون۔ رین۔ طبع۔ قفل، کے متعلق مفسرین نے جو بحثیں کی ہیں، ان سے بھی فطرتِ انسانی کے بہت سے گوشے سامنے آتے ہیں۔ ان کی بحثوں کا لب لباب یہ ہے۔

رین"۔ ایسا تغیر جو بیرونی اثرات سے پیدا ہو جاتا ہے۔ رین کے معنی زنگ کے ہیں۔ یہ لفظ اس ر دلالت کرتا ہے کہ کسی چیز کے اندر تغیر پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے اور وہ اپنی ماہیت کھو بیٹھی ہے۔ لے اظہار کے لئے رین کا لفظ بولا جاتا ہے۔

"طبع"۔ اس نے دوسرے کے نقش کو قبول کرنا شروع کر دیا ہے۔

"اقفال"۔ اب یہ چیز خود نہیں کھل سکتی۔ خدا ہی اسے کھول سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ رین سے مراد بیرونی گناہوں کا اس قدر اثر ہے کہ قلب جو نیکی کا منبع تھا، اس کی ماہیت ہی بدل گئی ہے اور اب وہ بدی میں دلیر ہو گیا ہے۔ لیکن طبع میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے دلوں پر گناہوں کا ٹھپہ لگ گیا ہے۔ اقفال ان کی اصلاح اپنے اختیار سے باہر ہو گئی ہے۔

اس موضوع پر قرآن و حدیث میں اور صوفیاء اور مفسرین کے ہاں جو مواد موجود ہے، اس کی روشنی میں فرد اور معاشرہ کے ربط باہم کا مسئلہ بھی سلجھ جاتا ہے۔ اسلام کے نظریہ کے مطابق انسان معاشرتی تقاضوں کے ہاتھوں مجبور محض نہیں ہے۔ لیکن وہ ان اثرات سے بھی دامن نہیں بچا سکتا۔ اسی وجہ سے قرآن و حدیث میں انفرادی اصلاح کے علاوہ اجتماعی اصلاح پر زور دیا گیا ہے۔ اور اسی لئے اقامتِ دینِ امتِ مسلمہ کا اوّلین فرض ہے۔ جب کسی معاشرے پر اس کے گناہوں کی وجہ سے عذاب نازل ہوتا ہے تو اس کی لپیٹ میں وہ صلحاء بھی آ جاتے ہیں جو گوشہ گزیں ہو کر اللہ کا نام لے رہے ہوتے ہیں۔ فرد اور سماج کے ربط باہم سے انسانی کردار کیسے متاثر ہوتا ہے، اس کو نبی اکرمؐ نے مختصر سے الفاظ میں واضح کر دیا ہے "ہر بچہ فطرتِ سلیم لے کر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے والدین اسے مجوسی، یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں" معاشرے کے ہمہ گیر اثرات کو واضح کرنے کے لئے ہی قرآن نے بدی کی راہ کو اسفل سافلین کہا ہے یعنی انسان لڑھکتا چلا جاتا ہے۔ دھیرے دھیرے خود بخود معاشرے کا رنگ اپنا لیتا ہے۔ نیکی کی راہ کو سورۂ بلد میں "اقتحام عقبۃ" دشوار گذار پہاڑی کو سر کرنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کی دعوت کا آغاز ملوک اور ان کے حواریوں "ملا ھم" سے ہوتا ہے۔

قرآن و احادیث کی روشنی میں انسانی فطرت کے ان پہلوؤں کی نشاندہی کے بعد چند اور سوالات بھی توضیح طلب ہیں۔ ان میں اوّلین سوال ان آیات کی توجیہہ و توضیح ہے، جن میں فطرتِ انسانی کے چند تاریک پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً انسان چھچھورا ہے۔ انسان ناشکرا ہے۔ انسان حریص ہے۔ انسان ظالم اور جاہل ہے۔ ان آیات کے سطحی مطالعہ سے اکثر حضرات کو یہ گمان گذرتا ہے کہ یہ آیات ان آیات کی تردید کرتی ہیں جن میں انسانی فطرت کے ارفع پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔ ان آیات کے پسِ منظر اور اصل مدعا کو نظر میں نہ رکھنے کی وجہ سے دبی زبان میں ان میں تناقض کا اعتراض بھی اٹھایا جاتا ہے۔ بظاہر یہ اعتراض بہت وزنی معلوم

ہوتا ہے لیکن یہ اعتراض دقتِ نظر سے کام لینے اور ان آیات کے اصل مدعا پر غور کرنے سے از خود دُور ہو جاتا ہے۔ اوّلاً یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ان آیات میں جن صفات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، وہ تمام انسانوں پر لاگو نہیں ہوتیں۔ بلکہ ان کا مقصد چند انسانوں کی گمراہیوں پر گرفت کرنا ہے۔ دوسرے یہ امر بھی غور طلب ہے کہ یہ سلبی صفات ہیں۔ ان کی موجودگی کے لئے ایجابی صفات کا موجود ہونا ضروری ہے۔ ہم ناشکرا اُسے قرار دیتے ہیں جو شکر پر قادر ہو۔ اور جاہل اور ظالم اُسے کہیں گے جو علم اور عدل کی قدرت رکھنے کے باوجود اس سے کام نہ لے۔ اس سے اس بات کی بھی تائید ہوتی ہے کہ ان آیات کا بنیادی مقصد ان ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلانا ہے، جن سے انسان انحراف برت رہا ہے۔ ان پہلوؤں کی طرف توجہ دلانے کا مدعا یہ بھی ہے کہ انسان اپنی فطرت کے کمزور پہلوؤں سے متنبہ ہے۔ اور اچھے پہلوؤں کا تحفظ کر سکے۔ یہ چیزیں نہ بطور چارج شیٹ پیش کی گئی ہیں۔ اور نہ جبریت کا تصور دینے کے لئے۔ بلکہ ان سے ایسے پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو ایک طرف ضروری بھی ہیں لیکن انہیں کا حد سے تجاوز ہونا خرابیاں بھی پیدا کرتا ہے۔

اس شبہ کے ازالہ کے بعد یہ اہم سوال بھی قابلِ غور ہے کہ انسان اگر طبعاً سلیم الفطرت ہے تو کیا وجہ ہے کہ طاغوتی طاقتیں اکثر و بیشتر غالب رہی ہیں اور دنیا میں ہر دَور میں جبر و تشدد اور ظلم و تعدی کا ہنگامہ بپا رہا ہے۔ ایسے سعید اَدوار شاذ ہی آئے ہیں، جب انسانیت نے چین اور سکھ کا سانس لیا ہو۔ یہ سوال بہت اہم ہے۔ اور اس سوال پر غلط انداز سے سوچنے کی وجہ سے اکثر فلسفیوں اور ماہرینِ نفسیات نے انسان کو سراپا شر قرار دیا ہے۔ اور مایوسی اور قنوطیت کا شکار ہو کر جبریت کے تصور کی حمایت کی ہے۔ تاریخ انسانی کے دلدوز اور جانکاہ واقعات پر نگاہ ڈالنے سے کئی بار یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ دنیا ہنگامۂ شر کا دوسرا نام ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی صرفِ نظر ممکن نہیں کہ انسان نے کسی دَور میں بھی باطل کو باطل جان کر قبول نہیں کیا۔ باطل کو ہمیشہ حق کے لبادے میں پیش کیا گیا ہے۔ باطل کے ان جھوٹے لبادوں سے چند دنوں کے لئے آنکھیں ضرور خیرہ ہوتی رہی ہیں لیکن بالآخر ہر دَور میں طلسم سامری کو توڑنے کے لئے کوئی نہ کوئی موسیٰ بھی جنم لیتا رہا ہے۔ چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی کی پیہم پیکار اس حقیقت کی غماز ہے کہ نیکی اور اچھائی کی طلب ہر دَور میں موجود رہی ہے۔ لیکن چوں کہ عنانِ اقتدار خود غرض لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے اس لئے نیکی کی قوتیں مجتمع نہیں ہو سکیں۔ انسان نے عجلت میں بعض اوقات بدی کو نیکی سمجھ لیا ہے۔ لیکن اس کا مقصود بدی اور شر کبھی نہیں رہا۔ اس حقیقت کی طرف قرآن نے یوں توجہ دلائی ہے: "ویدع الانسان بالشر دعاءہ بالخیر وکان الانسان عجولا" اسی

کیفیت کو قرآن نے سولت نفسہٗ کے الفاظ میں بھی ظاہر کیا ہے۔ یعنی اس کے نفس نے اس بُرائی کو دلفریب بنا کر پیش کیا۔ غلط ماحول، غلط تربیت اور غلط معاشرے کی وجہ سے مختلف اَدوار میں ضمیر کی روشنی ماند ضرور پڑ جاتی رہی ہے لیکن کوئی دَور بھی ایسا نہیں جب یہ روشنی بالکل بجھ گئی ہو۔ فطرتِ انسانی میں نیکی اور اچھائی کی طلب کا داعیہ اور اس کے حصول کے لئے انسان کی ان گنت قربانیاں انسانیت کے روشن اور تابناک مستقبل کی ضامن ہیں۔ فطرت انسانی کے اس داعیہ کو سامنے رکھ کر جب مختلف واقعات کا جائزہ لیا جائے تو مایوسی کی وہ تمام گھٹائیں چھٹ جاتی ہیں، جو وقتی طور پر تاریخِ انسانی اور فطرتِ انسانی کے یک رخا مطالعہ سے دل و دماغ پر چھا جاتی ہیں اور انسان کو مایوسی اور قنوطیت کے قعر میں گرا دیتی ہیں۔

اسلام کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے انسان کو نہ تو اندھی اور بہری خارجی قوتوں کا تابع مہمل قرار دیا نہ جبلتوں کے ہاتھوں میں کھلونا۔ بلکہ ان قوتوں اور جبلتوں کا صحیح رُخ متعین کرنے میں مدد دی ہے۔ اسلام نے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ فطرتِ الٰہی کا منشا انسانی خواہشات پر پہرہ بٹھانا ہے نہ انسانی جبلتوں کو فنا کرنا۔ فطرت حق صرف یہ چاہتی ہے کہ انسان اپنی ان خواہشات کو پورا کرنے اور ان استعدادات سے کام لینے میں نراحیوان نہ بن جائے۔ اسلام نے انسانی جبلتوں کی افادیت کو واضح کرنے کے علاوہ ان کے اظہار کی متوازن راہیں بھی متعین کیں۔

افسوس یہ ہے کہ جدید علم نفسیات کا ارتقاء ایسے دَور میں ہوا ہے، جب مغرب میں خود غرضی اور نفسا نفسی اپنے عروج پر تھی اور تنازع للبقاء کے نظریہ کے سہارے انسان انسان کا گلا کاٹ رہا تھا۔ ایسے حالات میں جنم لینے کی وجہ سے فرائڈ جیسے نابغہ روزگار کی نظروں سے بھی وہ پہلو اوجھل رہے جو ایثار، بے نفسی اور بے لوثی کے مظہر ہیں لیکن آہستہ آہستہ یہ حقیقت روشن ہوتی جا رہی ہے کہ انسان کے بارے میں یہ تصور غلط ہے اور یورپ میں فرائڈ کی فکر کے خلاف بغاوت جاری ہے۔ اور یہ بغاوت خود اس حقیقت کی شاہد ہے کہ انسان ہزار بار بھٹکنے کے باوجود اچھائی کا جویا ضرور رہتا ہے۔ اور اس کی کوتاہیاں، جذبات کے ہیجانات میں آ جانے یا مبینہ اور اٹل الہامی ھدایات کو نظر انداز کرنے کی صورت میں سرزد ہوتی ہیں۔ ورنہ انسان طبعاً سلیم الفطرت ہے اور نیکی اور بدی میں امتیاز کی صلاحیتوں سے پوری طرح بہرہ ور بھی۔